POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 April 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85واں سال

Date of Publication: 16-04-2024 • Price: 5/- • 15-28 April 2024 • Issue: 15,16 • Vol: 83

۱۵تا۲۸ اپریل ۲۰۲۴ • شمارہ ۱۵،۱۶ • جلد ۸۳

پروفیسر آفاق احمد کا کارِ جہاں دراز

عارف عزیز

دو قافلہ جسے ہم پرانی پیڑھی کے نام سے جانتے ہیں، افق کی پنہائیوں میں گم ہو رہا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں بوئی ہوئی فصل تیزی سے کٹ رہی ہے۔ وہ محفل جو 1930-40 میں سجی تھی اور 1950-60 تک سرشار، سرمستی اور خود فراموشی کے عروج پر نظر آتی تھی، اس کی بساط الٹ گئی ہے۔ یہ تاثر اس موقعے پر شدید ہو جاتا ہے، جب اس پیڑھی کا کوئی فرد بچے کی طرح چھوٹ کر وقت کے اس سیل رواں میں کھو جاتا ہے، جو ازل سے ابد تک بہہ رہا ہے۔

استاد گرامی پروفیسر آفاق احمد کا شمار اردو دنیا کے ان ہی استادوں، ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو آسمان ادب پر پوری نصف صدی تک اپنی تابانی بکھیر کر ایک جہاں کو خیرہ کرتے رہے۔ آفاق صاحب بلند پایہ استاد ہی نہیں، معیاری تحقیق کار اور محقق و مولف بھی تھے، بظاہر شمار میں ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو اردو تدریس و تحریک سے مستقلاً جوڑے رکھا تھا، تاہم ان کی طبع زاد چار کتب اور تالیف کردہ 19 کتابیں علم و ادب سے ان کے گہرے شغف کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی طرح اردو تحریک میں ان کے استغراق کا اندازہ انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش اور انجمن ادبی لیگ کی صدارت سے ہوتا ہے جو وہ پچیس تیس سال سے انجام دے رہے تھے۔ ایک اور ادبی انجمن حلقۂ ارباب ادب کے بانی اور جنرل سکریٹری کی ذمے داری وہ اس سے زیادہ پچپن سال سے نبھا رہے تھے۔

آفاق صاحب ایک بڑے عہدے سے اس وقت نوازے گئے جب 1989 میں انھیں انجمن اساتذۂ اردو جامعات کی صدارت تفویض ہوئی۔ آفاق صاحب سے پہلے اور بعد میں یہ اعزاز صرف یونیورسٹی پروفیسر کو ہی ملتا تھا۔ عبدالقادر سروری، نورالحسن ہاشمی، آل احمد سرور اور محمد حسن جیسی شخصیتیں اس عہدے سے سرفراز ہوتی رہی ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد 30 مئی 1932 کو بھوپال کے نجیب الطرفین خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا پدری تعلق ایک فوجی گھرانے سے ہے۔ والد اعجاز احمد ریاست بھوپال کی فوج میں کپتان تھے۔ ننھیالی رشتہ مرزا غالب کے شاگرد مولانا عباس رفعت شیروانی سے پانچویں پیڑھی میں ملتا ہے۔ نانا سید علی نقوی ریاست کے منصب داروں میں تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آفاق صاحب کی اعلا تعلیم کے مراحل بھوپال کی مشہور درس گاہ گورنمنٹ حمیدیہ کالج میں طے ہوئے جو اس وقت معیاری تعلیم کے لحاظ سے کسی اعلا یونیورسٹی سے کم نہ تھا اور اس کا اردو شعبہ تو نامور اردو اساتذہ اور ادیبوں کی آماجگاہ تھا۔ جس دور میں آفاق صاحب یہاں زیر تعلیم تھے، اس سے کچھ ہی پہلے جاں نثار اختر، پروفیسر کے عہدے کو خیرباد کہہ کر ممبئی چلے گئے تھے لیکن ان کی بیگم صفیہ اختر انتقال تک کالج سے وابستہ رہیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر سلیم حامد رضوی جیسی ممتاز ادبی شخصیتیں شعبۂ اردو سے وابستہ تھیں۔ ان لائق اساتذہ کی نگرانی میں آفاق صاحب نے ایم اے اردو میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔

پروفیسر آفاق احمد کو خوش قسمتی سے حمیدیہ کالج میں ہی 1959 میں لیکچررشپ مل گئی۔ پروفیسر کے عہدے پر 1972 کے دوران ان کی ترقی ہوئی اور 1992 میں حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ آفاق صاحب کی ملازمت کا طویل عرصہ گورنمنٹ مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج بھوپال میں گزرا۔ دوران تعلیم سے طلبہ تحریکات اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔

شادی 1960 میں ہوئی تو اہلیہ بلقیس جہاں صاحبہ بھی اعلا تعلیم یافتہ اور ہم مذاق ملیں۔ وہ بیک وقت انگریزی اور اردو ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں اور پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ایک ٹورنٹو دوسری نیویارک میں برسرکار ہیں۔ آفاق صاحب کے چھوٹے بھائی قمر اشفاق صاحب روزنامہ 'ندیم' کے ایڈیٹر، دوسرے بھائی شفیق اعجاز صاحب تجارت میں مصروف ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد اپنی خداداد صلاحیت اور اساتذہ کی تربیت کے نتیجے میں بہت جلد اپنے اساتذہ کی صف میں کھڑے نظر آنے لگے اور ایک وقت وہ آیا کہ اپنے اساتذہ کے لیے اور اساتذہ اپنے شاگرد کے لیے باعث فخر ثابت ہوئے۔ آفاق صاحب اعلا درجے کے مدرس ہونے کے ساتھ اول درجے کے کھلاڑی بھی تھے۔ انھوں نے 1958 میں سری لنکا میں منعقدہ بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ میں بھوپال ہاکی ٹیم کی بطور کپتان قیادت کی اور دیگر دو میچوں میں ٹیم ان کی قیادت میں جیتتی رہی۔ وکرم یونیورسٹی ٹیم کی نمائندگی کے ساتھ ہاکی کے علاوہ باسکٹ بال اور جمپنگ میں بھی انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ جلد ہی ان کی شناخت ایک ایسے ماہر تعلیم کی ہوگئی جو طلبہ کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی بلکہ عرق ریزی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ حمیدیہ کالج اور مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج کی ملازمت کے عرصے میں انھوں نے جہاں سیکڑوں طلبہ و طالبات کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کیا، وہیں 29 طلبہ و طالبات کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کرائی، جب کہ 21 طلبہ نے ایم اے سال آخر کے مترادف تحقیقی مقالے اپنی زیر نگرانی مکمل کروائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبۂ تعلیم میں ان کی سرگرمی مثالی رہی۔ اسی طرح ان کے زیر تعلیم و تربیت جو طلبہ رہے فراغت کے بعد انھوں نے جن شعبوں میں قدم رکھا، ان میں اپنی خاص شناخت بنائی۔ ایسے ہونہار طلبہ میں ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر راحت اندوری، ڈاکٹر وحید حقی (سبکدوش پولس افسر) شامل ہیں۔

خود آفاق صاحب نے سراج میر خاں سحر بھوپالی، رشید احمد صدیقی، مخلص بھوپالی، پریم چند، اقبال اور مہدی افادی پر جو مقالات تحریر کیے، انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ مقالات 'امانت قلب و نظر' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

بڑے ادیبوں کی ایک پہچان یہ ہوتی ہے کہ نئی نسل کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اور آفاق صاحب بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ اسی فکرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا۔ پہلی کتاب 'پریوں کی ملکہ' (بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ) 1960 میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب 'پرشور خاموشی' (افسانوں کا مجموعہ) 1991 میں منظر عام پر آئی۔ تیسری کتاب 'ایک کرن اجالے کی' (راج گوپال اچاریہ کی کہانیوں کا اردو ترجمہ) 1995 اور چوتھی کتاب 'امانت قلب و نظر' (مضامین کا مجموعہ) 2007 میں طبع ہوئی۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

دوسری اور آخری قسط

نیّر مسعود کی شخصیت کے چند پہلو

کچھ دیدہ کچھ شنیدہ

شعیب نظام

نیر بھائی کا پروفیسر شپ کے لیے تقرر ہو گیا مگر شعبے کے ہی کسی کرم فرما نے کوئی نکتہ لگا دیا جس کی وجہ سے تقریباً ایک سال بعد اپروول مل سکا۔ نیر بھائی بھاگ دوڑ والے آدمی نہیں تھے اور کلرک بطور چپے لیے کام کرنے کے عادی نہیں تو دیر تو ہونی ہی تھی۔ انیس اشفاق صاحب بار بار کہتے رہے بھائی بہت نقصان ہو رہا ہے ادھر سے جواب ملتا ہو ہی جائے گا سب ٹھیک ہے۔

ریٹائرمنٹ کے وقت شعبے کے کئی پروفیسروں نے میرٹ ایوارڈ کا سرٹیفکٹ لگا کر دو سال کی توسیع حاصل کر لی کیونکہ مستند یونیورسٹی میں سرٹیفکٹ حاصل کرکے یہ سہولت ملی تھی۔ نیر بھائی نے بھی اپنا سرٹیفکٹ لگایا مگر کسی دوست نے ایک درخواست گزار دی۔ نیر صاحب نے دوڑ بھاگ کرنے کے بجائے ہمیشہ کی طرح صبر کر لیا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ نیر بھائی جیسے فرشتہ خصلت انسان کے بھی دشمن ہو سکتے ہیں مجھے اب بھی یقین نہیں آتا مگر ان واقعات کو کیا کیا جائے اور ان کی کیا تاویل کی جائے۔

نیر بھائی کاظم علی خاں صاحب کے ساتھ امین آباد سے رکشے پر نخاس جا رہے تھے۔ خاں صاحب نے کوئی تحقیقی مسئلہ چھیڑ دیا ویسے بھی تحقیق ان پر سوار رہتی تھی۔ راستے میں رکاب گنج کے پاس بقرعید کی وجہ سے بکروں کا بازار لگا تھا نیر بھائی نے دریافت کیا خاں صاحب آپ کو بکروں کی پہچان ہے۔ خاں صاحب نے کئی خصلتیں گنا دیں نیر بھائی نے کہا میرے لیے ایک بکرا دیکھ لیجیے۔ خاں صاحب اتر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بکروں کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ نیر بھائی نے رکشے والے سے کہا چلو بھائی اور وہ گھر آ گئے۔ بعد میں نیر بھائی نے جو بھی جواب دیا ہو مجھے نہیں معلوم۔

پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب نے اپنے گھر پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا اور نیر بھائی سے بتایا کہ ایک بہت اچھے شاعر باہر سے میری دعوت پر آ رہے ہیں آپ ضرور آئیے اور خصوصاً انھیں سنیے آپ کو لطف آئے گا۔ نیر بھائی نے جواب دیا ولی بھائی میں اس طرح کی محفلوں میں کہاں جاتا ہوں مگر ولی صاحب کے مسلسل اصرار پر نیر بھائی نے وعدہ کیا ہم لوگ تو صرف ولی صاحب کی اطلاع ہی کے منتظر تھے نیر نشست ہوئی اور خصوصی شاعر نے بے حد کمزور اور پھسپھسی غزلیں سنائیں۔ ولی صاحب شاید اخلاقاً داد دیتے رہے۔ واپسی پر نیر بھائی کو رخصت کرنے وہ سڑک تک آئے۔ نیر بھائی نے ان سے کہا ولی بھائی میں آپ کی اس حرکت کا انتقام ضرور لوں گا۔ میں اسے درگزر شاید نہ کر پاؤں۔ ولی بھائی نے صرف اتنا کہا کہ مجموعی طور پر نشست تو ٹھیک تھی ہاں مگر نیر صاحب نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا مگر وہ آپ کے مہمان شاعر تھے میں یاد رکھوں گا۔ ظاہر ہے شاید یہ وقتی ردعمل تھا وہ کسی کی دل آزاری شاید کر بھی نہیں سکتے تھے۔

ایک دن عرفان صدیقی صاحب اور ہم لوگ نیر بھائی کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے اور موجودہ شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ نیر صاحب نے کہا آج کل کے شاعروں کو چھوڑ کر اساتذہ سے کہاں جاؤں نے شاید عورت کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ عرفان بھائی بولے دیکھیے فقیر پوری کوشش کرتا ہے اس کے کچھ دنوں بعد 'شب خون' اور 'سوغات' میں دو غزلیں شائع ہوئے نظمیں جو بعد میں ان کے مجموعے 'عشق نامہ' میں شامل ہیں یا کیا مجموعہ بھی عرفان بھائی کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

خیر چائے آ گئی عرفان بھائی نے کہا جناب چائے تو عمدہ ہے ہی کراکری بھی بہت نفیس ہے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد نیر بھائی نے مجھ سے کہا اتوار کو عرفان صاحب کے یہاں چلتے ہیں۔ میں نے کہا میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ہم لوگ شام کو عرفان بھائی کے یہاں پہنچے تھوڑی دیر بعد نیر بھائی نے تھیلے سے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی بھاری چیز نکالی عرفان بھائی نے پوچھا نیر صاحب اس میں کیا ہے۔ نیر بھائی بولے اس دن آپ نے جو کراکری پسند کی تھی اس کا دوسرا سیٹ اتفاق سے مل گیا وہ آپ کے لیے لیتا آیا۔ نیر صاحب کے جانے کے بعد عرفان بھائی نے کہا نیر صاحب بہت شریف آدمی ہیں۔ میرے منہ سے نکل گیا جی ہاں اس میں کیا شک ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکال لیے کہ آپ مستقبل میں ان کی جو چیز پسند کریں گے وہ آپ کو پیش ہی کر دیں گے۔ عرفان بھائی دیر تک ہنستے رہے۔

فاروقی صاحب، زیب غوری اور ڈاکٹر کیسری کشور سے نیر صاحب بہت بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے، اس وقت ان کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی دیکھنے اور سننے کی چیز ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کیسری کشور کے انتقال کے بعد اس حلقے میں عرفان بھائی شامل ہو گئے تھے۔ اس بے تکلفی کی ایک جھلک رسالہ 'سوغات' میں نیر بھائی کا جو انٹرویو شائع ہوا ہے، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آخر میں گفتگو ادب سے ہٹ کر ذاتی جملے بازی پر ختم ہوئی تھی اسی لیے یہ نوٹ لگانا پڑا کہ ٹیپ ریکارڈ خراب ہونے کی وجہ سے گفتگو یہیں تک ریکارڈ ہو سکی ہے۔

نیر صاحب کو پریسیڈنٹ ایوارڈ، میر ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سرسوتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ادارے ان کو ایوارڈ دے کر خود سرخرو ہوئے۔ ویسے نیر بھائی کو کسی بھی ایوارڈ سے ان کے ادبی قد کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے افسانے انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ انگریزی میں محمد عمر میمن نے ان کے افسانوں کے ترجمے کیے تھے وہ ترجمہ کرکے افسانے نیر صاحب کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بھیجتے تھے۔ نیر بھائی کبھی کبھی ایک آدھ جملے یا لفظ بدل دیتے تھے جس پر میمن صاحب عش عش کرتے تھے کہ کمال ہے صاحب یہ لفظ میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔

نیر صاحب سے پیرس کے ایک مشہور اشاعتی ادارے نے ان کی کتاب چھاپنے کی اجازت مانگی اور یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ آپ کی کتاب پر میں سلمان رشدی سے پیش لفظ لکھوانا چاہتا ہوں یہ میری کاروباری ضرورت ہے۔ نیر بھائی نے جواب میں لکھا میں اپنی کتاب پر اس ملعون سے پیش لفظ تا قیامت لکھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ کتاب شائع کریں یا نہ کریں۔

ان کو جب سرسوتی سمان سے نوازا گیا اور فرمائش کی گئی کہ آپ اپنے حالات زندگی اور افکار و احوال پر لکھ کر ادارے کو بھیج دیجیے ادارہ اپنی روایت کے مطابق اسے شائع کرے گا۔

نیر بھائی نے ایک پیراگراف لکھ کر بھیج دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ آپ کے ادبی قد کے اعتبار سے یہ تحریر ناکافی ہے تفصیل سے لکھ دیجیے نیر بھائی نے انکار کر دیا کہ بس میں اتنا ہی لکھ سکوں گا۔ ویسے بھی لکھنا تو دور وہ اپنے بارے میں خصوصاً ادبی کارناموں پر کوئی بھی گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار مجھ سے کہا بھی تھا کہ کوئی میرے منہ پر میری تعریف کرنے لگتا ہے تو میں سمجھ نہیں پاتا ہوں کہ مجھے کس طرح React کرنا چاہیے، بڑی شرمندگی سی ہوتی ہے۔

نیر صاحب کے گھر پر فاروقی صاحب، عابد سہیل صاحب اور نیر بھائی رات بہت دیر تک گرما گرم بحثیں کرتے رہتے تھے درمیان میں فاروقی صاحب "کیا کہتے ہو" "کہاں کی اڑا رہے ہو" کی گردان کرتے رہتے تھے۔ رات بہت ہو جانے پر فاروقی صاحب نیر بھائی کے یہاں ہی سو رہتے تھے۔

انیس اشفاق صاحب بتا رہے تھے کہ ایک دن گوپی چند نارنگ، انتظار حسین، عابد سہیل، نیر بھائی اور فاروقی صاحب افسانے کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے بحث وہاں تک پہنچ گئی جہاں آستینیں تک چڑھنے کی نوبت آ گئی۔ نیر بھائی اس طرح کی بحثوں میں اپنی بات توازن کے ساتھ رکھتے تھے مگر اپنا موقف درست جانتے تو اپنی بات پر آخر تک قائم رہتے تھے۔

نیر بھائی کبھی کبھی اپنے غصے کا اظہار بھی سختی سے کر دیتے تھے مگر ایسے مواقع نہ کے برابر آتے تھے ورنہ بقول خود ان کے وہ صبر سے ہی کام لیتے تھے۔ ایک بار ریڈیو سے فون آیا کہ جناب فلاں موضوع پر کل آپ کی ریکارڈنگ ہے۔ نیر بھائی نے کہا کہ آئندہ مجھے پہلے سے بتا دیا کیجیے اس طرح لکھنے یا بولنے کا میں عادی نہیں ہوں مگر ریڈیو کے پروڈیوسر کسی کو کیا کرایں پر گویا احسان کرتے ہیں اگلی بار پھر فون پر بتایا گیا کہ کل آپ کی ریکارڈنگ ہے۔ نیر بھائی نے جواب دیا جو آپ کے ایک فون پر آتا ہو اسے بلا لیجیے میں نہیں آ رہا ہوں اور آئندہ آپ کا افسر اس دن پہلے آ کر مجھ سے کانٹریکٹ دے جائے ورنہ مجھے معاف رکھا جائے اور آئندہ نہ بلایا جائے۔

نیر مسعود صاحب تحقیق کے میدان میں اردو دنیا میں اپنے تحقیقی مقالے رجب علی بیگ سرور کی اشاعت کے بعد قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ اتنا وقت گزرنے کے باوجود یہ کتاب آج بھی سرور پر سب سے معتبر حوالہ تصور کی جاتی ہے۔ جب رشید حسن خاں صاحب 'فسانۂ عجائب' مرتب کر رہے تھے تو انھوں نے بار بار نیر صاحب سے رجوع کیا اور خطوط کے ذریعے بار بار لفظوں اور جملوں کی وضاحت طلب کی اور ہر بار نیر صاحب نے ان کے سوالات کے تسلی بخش اور تفصیلی جوابات دیے۔

'دولہا صاحب عروج' 'یگان' کی تحقیق قدم قدم پر حوالوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ جب تک تمام شواہد کو یکجا کر کے خود مطمئن نہیں ہو جاتے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ ان کے والد کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ایک نایاب سرمایہ ہے جو نہ صرف نیر صاحب کے کام آیا بلکہ اردو کے بڑے محققین کے لیے بھی ایک نعمت ثابت ہوا۔ رشید حسن خاں، گیان چند جین، قاضی عبدالودود اور خلیق انجم وغیرہ نے بار بار ضرورت پڑنے

برنی صاحب سے رجوع کیا اور انھوں نے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کسی کو مایوس نہیں کیا۔

میر انیس سے ان کے والد مسعود حسین رضوی ادیب کو گہرا لگاؤ تھا پہلے میر انیس پر کام کرنے کے لیے انھیں ہی دعوت دی گئی تھی مگر وہ یہ کام کرنے سے پہلے ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ زیادہ تر مواد گھر کی لائبریری ہی میں موجود تھا۔ نیّر صاحب نے اس کام کو جذباتی طور پر قبول کیا اور مواد کی فراہمی اور اسے حسب ضرورت ترتیب دینے میں انھیں خاصہ وقت لگا۔ وہ بغیر معتبر حوالوں کے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ کام دبیر سے طویل ہوتا گیا اور 'مرثیہ خوانی کا فن' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' جیسی کتابیں بھی اصل میں اسی کام کا حصہ ہیں۔ ضخامت کی وجہ سے اسے تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ 'مرثیہ خوانی کا فن' تحقیق کی دنیا کی ایک نادر کتاب ہے اس موضوع پر ایک دو صفحے سے زیادہ مواد اور کہیں فراہم نہیں ہوتا مگر نیّر صاحب نے اپنی تلاش اور جستجو سے ایک پوری کتاب تیار کردی جسے تحقیق کی دنیا کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

'انیس سوانح' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' میں وہ قدم بہ قدم پر معتبر حوالوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ اپنے معتبر حوالوں تک رسائی آسان نہیں ہوسکتی، اسی لیے اس کام میں تلاش اور جستجو نے کئی سال ان سے ان تھک محنت کرائی۔ نیّر صاحب نے بغیر نام لیے شبلی کی معروف تصنیف کا ازالہ بھی کردیا اور سوانح انیس اپنے موضوع پر ایسا زبردست تحقیقی کارنامہ ہے کہ شاید ہی مستقبل میں اس میں کوئی اہم اضافہ ہو سکے۔

نیّر بھائی نے میر انیس سے اپنی عقیدت کہیں ظاہر نہیں کی ہے کب اور کہاں انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ پڑھا اور کس طرح منبر پر بیٹھتے تھے اور کس طرح مرثیہ پڑھتے تھے۔ سننے والوں پر کیا اثر ہوتا تھا۔ انھوں نے حقہ پینا کب شروع کیا، کن باتوں پر انھیں غصہ آتا تھا، ان سب باتوں کے لیے انھوں نے قدم قدم پر مستند حوالوں کے ساتھ اپنی بات کی ہے۔ یہ کتاب نصاب میں داخل ہونی چاہیے کہ تحقیق کا معیار کیسا ہونا چاہیے، طلبہ بھی جان سکیں۔ اس کتاب میں میر انیس کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ایسی عمدہ تحقیقی کتاب میری نظر سے اس سے پہلے نہیں گزری ہے۔ ہر چند میں رشید حسن خاں کی تدوین اور ان کے تحقیقی کاموں کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں۔

دولہا صاحب عروج میر انیس کے پوتے تھے اصل نام سید خورشید حسن تھا مگر دولہا صاحب عروج کے نام سے ہی مشہور ہوئے صاحب کمال مرثیہ گو تھے۔ 164 صفحات میں نیّر صاحب نے اس دور کی مرثیہ خوانی اور اس میں دولہا صاحب عروج کے امتیازات کا بہت عمدہ اور مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کیا ہے، مرثیہ خوانی کے فن پر ان کی کتاب کے ابتدائی نقوش اس کتاب میں بھی ملتے ہیں۔

'مراثی انیس' 1998 میں شائع ہوئی۔ 533 صفحات کو میر انیس کے مراثی کی صحت کے ساتھ شاندار طباعت اور گراں قدر مقدمہ۔ یہ کتاب میر انیس کے کلام کے شایان شان ہے۔

نیّر صاحب نے میر تقی میر کے فارسی کلام کو مدون کر کے صحت کے ساتھ ایک تفصیلی مقدمہ لکھا اور 'نقوش' کے ایک پورے شمارے میں یہ کلام شائع ہوا۔ اس سے پہلے میر کا مکمل فارسی کلام ہمارے سامنے نہیں آیا تھا۔ اسے ہم نیّر صاحب کا نایاب تحفہ قرار دے سکتے ہیں۔

'یگانہ احوال و آثار' نیّر صاحب کی بہترین تصنیف ہے۔ خصوصاً غالب شکن، شہرت کا ڈیبا اور یگانہ کے معرکے بہت عمدہ اور واضح طور پر ان کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ یگانہ شناسی کے لیے یہ بہت اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔

'مکاتیب مشاہیر بنام مسعود حسین رضوی ادیب' میں اس زمانے کے تمام مشاہیر ادب کے بہت اہم خطوط ہیں جن میں ادب کے حوالے سے اور تحقیق کے نقطۂ نظر سے بہت کارآمد معلومات کا گویا ایک خزانہ موجود ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کی ہے۔

'شفاء الدولہ کی سرگزشت' اس میں نواب شفاء الدولہ کے حالات موجود ہیں۔ نیّر صاحب نے اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ اسے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب بھی اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کی ہے۔

'تعبیر غالب' نیّر صاحب کی بہت اہم کتاب ہے اس میں ان شعروں کی تفہیم کی گئی ہے اور صرف متن سے سروکار رکھا گیا ہے۔ دوسرے شارحین غالب سے اختلاف کرتے ہوئے نیّر صاحب نے غالب کے مشکل شعروں کو گویا آئینہ کردیا ہے۔ اس میں ایک شعر پر فاروقی صاحب سے بھی ان کا اختلاف ہوا تھا جو 'شب خون' کے کئی شماروں تک شائع ہوتا رہا۔

نیّر صاحب نے غالب کے استعاروں پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔

> **نیّر صاحب موضوع کے اعتبار سے جس طرح اپنا اسلوب بدل لیتے ہیں وہ حیران کرنے والا ہے۔ ان کے خالص تحقیقی موضوعات پر لکھی گئی تحریریں بھی بہت دلچسپ ہوتی ہیں جب کہ عام طور پر انتہی خشک موضوعات پر اس طرح لکھنا کہ پڑھنے والا خواہ اسے تحقیق سے زیادہ دلچسپی نہ ہو اسے بھی لطف آئے، یہ نیّر صاحب کا کمال ہے۔ اپنی تحقیق اور تنقید میں وہ مرعوب کرنے کے بجائے متاثر بہت کرتے ہیں کہیں بھی تحریر گنجلک نہیں ہوتی۔ کم سے کم لفظوں میں وہ اپنا مدعا اس سادگی اور اثر پذیری کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس کی کوئی مثال اردو میں محمد حسن عسکری کے سوا کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ معروف مفکروں کی آرا کا سہارا لیے بغیر اپنا موقف پوری طرح پڑھنے والے تک منتقل کر دیتے ہیں۔**

اور وہ ہر شعر کے تقریباً چھ سات مفاہیم بیان کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کتنی دیدہ ریزی اور کلاسیکی روایت سے پوری آگاہی کے ساتھ غالب پر قلم اٹھاتے ہیں۔ نیّر صاحب کی ہر تحریر عمومیت سے ماورا ہے وہ بھی قلم اٹھاتے ہیں جب وہ کوئی اہم اور نئی بات کہنا چاہتے ہیں۔

غالب شناسی کے باب میں یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اسی میں غالب کے کلام میں معنی کی پیش رفت جیسے عمدہ عنوان سے انھوں نے غالب کے شعروں پر بے مثال بحث کی ہے۔

'بستان حکمت' کے نام سے 'پنج تنتر' کا ایک ترجمہ فقیر محمد گویا نے کیا تھا، اسی کتاب کو نیّر صاحب نے مرتب کیا اور ایک بیش قیمت مقدمہ لکھ کر اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع کرایا۔

'افسانے کی تلاش میں' نیّر صاحب کی بہترین تنقیدی کتاب ہے اس میں ظہیر الدین احمد، سید رفیق حسین اور عزیز احمد کے بہترین افسانوں پر بہت عمدہ مضامین ہیں۔ یہ مضامین 'سوغات' میں شائع ہو چکے ہیں جب انھیں آئین پوش ہوئیں کے تجزیے پر محمود ایاز مدیر 'سوغات' نے لکھا تھا کہ اس شاندار تجزیے سے عزیز احمد کی روح ضرور مسرور ہوئی ہوگی۔

'حکیم جاپاتات' یہ دراصل ایک ترکی ڈرامہ ہے جس کا پہلے فارسی میں ترجمہ ہوا اور فارسی سے اسے اردو کے قالب میں نیّر صاحب نے ڈھالا۔

'کاناکا کے افسانے' فرانز کافکا کے منتخب افسانوں کا انگریزی سے بہت رواں اور اصل سے قریب ترین ترجمہ نیّر صاحب کی دونوں زبانوں پر دسترس کی گواہی دیتے ہیں۔

'ایرانی کہانیاں' جدید فارسی کہانیوں کے تراجم پر مشتمل یہ کتاب پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔ بہت سلیس اور عمدہ تراجم پر مشتمل یہ کتاب ایران میں لکھے جانے والے افسانوں، ان کے موضوعات اور تکنیک کو سمجھنے میں بہت مددگار ہے۔

'خنک شہر ایران' نیّر صاحب لکھنؤ سے باہر جاتے ہوئے گھبراتے تھے شاید ہندوستان سے باہر انھوں نے صرف ایران کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کی روداد بہت دلچسپ اور ایران کی ثقافت کو سمجھنے میں ہماری بہت مدد کرتی ہے۔

'اودبستان' یہ نیّر صاحب کے خاکوں کا مجموعہ ہے اس میں سید احتشام حسین، صباح الدین عمر، عرفان صدیقی، محمود ایاز، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر کیسری کشور اور مسعود حسین رضوی ادیب کے خاکوں کے ساتھ ان کے مکان 'ادبستان' کا بے مثال خاکہ موجود ہے۔ ادیب پر نیّر صاحب کا خاکہ ادیب کی پوری شخصیت کو قارئین کے سامنے لا دیتا ہے۔

'حسن اشرف' واجد علی شاہ کے کلام کو یکجا کر کے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اسے شائع کرایا۔ اس طرح اودھ کے آخری تاجدار کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ رقص و سرور کی محفلوں کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال شاعر تھے۔

'منتخب مضامین' یہ کتاب بھی پاکستان سے شائع ہوئی ہے 'خنک شہر ایران' بھی اسی میں شامل ہے مختلف موضوعات پر مضامین کے ساتھ ساتھ اس میں رشید حسن خاں کے 'مثنویات شوق' کے مقدمے کے ردعمل میں لکھا گیا خط نما تبصرہ بھی ہے۔ اور سا گری سین گپتا کا لیا ہوا نیّر صاحب کا مشہور انٹرویو بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔

'سوتا جاگتا' بچوں کا ڈرامہ ہے جو الف لیلیٰ سے ماخوذ ہے بہت آسان اور پر اثر زبان میں لکھا گیا یہ ڈرامہ ہے تو بچوں کے لیے لکھا گیا ہے مگر ہر قاری کو یہ خاصہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

نیّر صاحب موضوع کے اعتبار سے جس طرح اپنا اسلوب بدل لیتے تھے وہ حیران کرنے والا ہے۔ ان کے خالص تحقیقی موضوعات پر لکھی گئی تحریریں بھی بہت دلچسپ ہوتی ہیں جب کہ عام طور پر انتہائی خشک موضوعات پر اس طرح لکھنا کہ پڑھنے والا خواہ اسے تحقیق سے زیادہ دلچسپی نہ ہو اسے بھی لطف آئے، یہ نیّر صاحب کا کمال ہے۔

اپنی تحقیق اور تنقید میں وہ مرعوب کرنے کے بجائے متاثر بہت کرتے ہیں کہیں بھی تحریر گنجلک نہیں ہوتی، کم سے کم لفظوں میں وہ اپنا مدعا اس سادگی اور اثر پذیری کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس کی کوئی مثال اردو میں محمد حسن عسکری کے سوا کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ معروف مفکروں کی آرا کا سہارا لیے بغیر اپنا موقف پوری طرح پڑھنے والے تک منتقل کر دیتے ہیں۔

نیّر مسعود نے پہلے ایک محقق کے طور پر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ رجب علی بیگ سرور، دولہا صاحب عروج اور میر انیس پر ان کی تحقیق ایک روشن مینارے کی صورت ہمیں راستہ دکھاتی رہیں گی کہ تحقیق کیسے کی جاتی ہے اور یہ کتنے صبر اور تحمل کا کام ہے۔

اس کے بعد وہ افسانہ نگاری کی طرف آئے۔ یہ جدیدیت کا وہ دور تھا جب ایسے افسانے لکھے جا رہے تھے کہ شاید بہت سے (بقیہ صفحہ [illegible] پر)

اردو دُنیا

مکتبہ جامعہ کو بچانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اولین ذمے داری

نئی دہلی (22 اپریل)۔ مکتبہ جامعہ محض تجارتی ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ اردو والوں کی پہچان اور ثقافت ہے۔ اس نے کئی نسلوں کے ذہنوں کی تربیت کی ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعارف میں اس کا نہایت روشن کردار ہے۔ ممکن ہے نئے وائس چانسلر کو یہ بات نہ معلوم ہو کہ ایک زمانے تک مکتبہ کے بغیر جامعہ ملیہ اسلامیہ ادھورا تصور کیا جاتا تھا۔ ان خیالات کا اظہار اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب مجاز خصوصاً وائس چانسلر کو فوراً اس معاملے پر توجہ دے کر عمل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ ماضی میں نجیب جنگ (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور پروفیسر خالد محمود کی کوششوں سے مکتبہ جامعہ کو ایک نئی زندگی ملی تھی۔ موجودہ وائس چانسلر کو بھی سابق وائس چانسلر کی طرح ہی اسٹیشنری اور بعض دیگر چیزیں مکتبہ جامعہ کے توسط سے جامعہ والوں کو خریدنے کا سرکلر جاری کرنا چاہیے۔ نجیب جنگ کے اس ایک فیصلے نے مکتبہ جامعہ کو مالدار بنا دیا تھا اور انھیں اردو کے ایک محافظ کے طور پر پیش کیا تھا۔ موجودہ وائس چانسلر کو بھی اسی فیصلے کو دوبارہ نافذ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نہ صرف مکتبہ محفوظ ہو جائے بلکہ ان کا ذکر بھی اردو سے محبت کرنے والوں میں ہو۔

ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ پوری اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ہو جس نے مکتبہ جامعہ کی کتابیں نہ پڑھی ہوں۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لیے مکتبہ جامعہ کی کتابیں آج بھی خاصی اہم اور ضروری ہیں۔ لہٰذا ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارگزار وائس چانسلر سے اپیل ہے کہ وہ مکتبہ جامعہ کو بچانے اور اسے بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدیم طلبہ سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اپنی مادر علمی کے ذمے داروں پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کو بچانے کے لیے دباؤ ڈالیں۔ اس موقعے پر انھوں نے کورواش علی، جاوید علی خاں، کمال اختر، فرحت عثمانی، محسن جامعی، عارف خاں شیروانی، بدرالدین قریشی، ڈاکٹر عمیر منظر اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابنائے قدیم سے بھی گزارش ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اردو کے اس ادارے کو بچا لیں۔ اپنی تاریخ اور تہذیب کو اپنی آنکھوں کے سامنے اس طرح مٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر سید احمد خاں نے یہ بھی کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو ہم قومی سطح پر تحریک شروع کریں گے اور مکتبہ جامعہ پر ہم قومی کوشش بھی کریں گے۔ (انقلاب۔ دہلی)

خورشید الاسلام یادگاری جلسہ

علی گڑھ (19 اپریل)۔ پروفیسر خورشید الاسلام ایک ذہین نقاد تھے۔ وہ کبھی پرانی باتیں نہیں کہتے تھے۔ ان کے یہاں ہمیشہ نیا پن ہوتا تھا۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے جو قول زریں قسم کے جملے لکھے ہیں ان کے لیے بہت زیادہ علم اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ معمولی ذہن کا کام نہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن رائٹر اور سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر طارق چھتاری نے ممتاز دانشور اور سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر خورشید الاسلام یادگاری جلسے میں کیا۔ بزم شہریار کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام میں انھوں نے کہا کہ خورشید الاسلام کی شاعری بالخصوص نظمیں بہت مختلف ہیں۔ ان کے یہاں تکرار نہیں ہے۔ آسان زبان میں جو تخلیقیت ہے اسی میں ان کی انفرادیت مضمر ہے۔ پروفیسر چھتاری نے کہا کہ بڑے بڑے سیمیناروں کے مقابلے میں ان جلسوں کی زیادہ اہمیت ہے۔

(ہمارا سماج۔ دہلی)

بہار میں ایک کروڑ تیس لاکھ ووٹروں کی زبان اردو انتخابی سیاست سے غائب

سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ہی اردو زبان سے وابستہ سیاست داں بھی بہار کی دوسری سرکاری زبان کو نظرانداز کر رہے ہیں

پٹنہ (24 اپریل)۔ لوک سبھا انتخابات 2024 کی مہم کے دوران امیدواروں سے لے کر ان کے حامی تک اردو کو بھولے ہوئے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں اور امیدواروں کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے انھیں اردو جاننے والے ووٹروں سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے جب کہ ریاست کے سات کروڑ 64 لاکھ ووٹروں میں ایک کروڑ 30 لاکھ سے زیادہ ووٹروں کی زبان اردو ہے۔ چند ایک انتخابی حلقوں میں اردو والے فیصلہ کن حالت میں ہیں۔ دوسری طرف ایک مدت سے اردو نائب مترجم کے امتحان کا نتیجہ شائع کرنے کی مانگ کرنے والے امیدوار اور ان کے حامی سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں اساتذہ تقرری امتحان میں اردو جاننے والے بہت سے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس کے باوجود اردو کے نام پر اپنا حق حصہ مانگنے والے سیاست داں بھی ووٹ مانگتے وقت اردو کو اس کا حق دینے سے کتراتے نظر آرہے ہیں۔ 'انقلاب' کے نمائندے نے سوشل میڈیا بطور خاص فیس بک پر چند ایک امیدواروں اور پارٹی کے دیگر لیڈروں کی پوسٹوں کو کھنگالا تو دور دور تک اردو میں کچھ لکھا نظر نہیں آیا۔

'انقلاب' کے نمائندے نے سب سے پہلے کم و بیش 70 فیصد اردو ووٹر والے لوک سبھا حلقہ کشن گنج سے امیدواروں اور ان کے اہم حامیوں کا سوشل میڈیا بالخصوص فیس بک اکاؤنٹ کھنگالا۔ یہاں سے جے ڈی یو امیدوار محمد مجاہد عالم جو دوبار اسی سے ایم ایل اے رہ چکے ہیں۔ وہ پچھلے دنوں تحلیل ہوئے بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے رکن بھی رہے ہیں۔ ان کے فیس بک پیج پر بھی کم سے کم پچھلے ایک ہفتے میں اردو کی کوئی پوسٹ نظر نہیں آئی۔

کشن گنج سے موجودہ رکن پارلیمنٹ اور کانگریس کے امیدوار ڈاکٹر محمد جاوید کے فیس بک صفحے پر اردو شاعری کے بل بوتے شہرت پانے اور راجیہ سبھا تک پہنچنے والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اقلیتی شعبے کے چیئرمین عمران پرتاپ گڑھی کی 24 اپریل کو کشن گنج آمد کا اشتہار بھی ہندی ہی میں ہے۔ انھوں نے اس سے قبل اجمیر شریف کی درگاہ اور کچھوچھہ شریف سے تعلق رکھنے والے حضرت سید بابا اشرف کی کشن گنج آمد کا اشتہار بھی ہندی ہی میں دیا تھا۔

آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین کے بہار ریاستی صدر اور موجودہ ایم ایل اے اور کشن گنج سے پارٹی کے امیدوار اخترالایمان کے فیس بک صفحے پر بھی اردو میں کوئی حالیہ پوسٹ دیکھنے کو نہیں ملی۔ ان کی انتخابی مہم کے پروگرام کا جو فیس بک پر اعلان ہے وہ بھی ہندی ہی میں ہے۔ یہاں تک کہ 24 اپریل کو بیرسٹر اسدالدین اویسی کی آمد کی اطلاع بھی ہندی ہی میں دی گئی ہے۔ کٹیہار سے کانگریس کے امیدوار طارق انور کے فیس بک صفحے پر بھی اگر آپ اردو کو تلاش کریں گے تو مایوسی ہاتھ لگے گی۔ ان کا فیس بک صفحہ بھی ہندی پوسٹ سے بھرا نظر آیا۔ پچھلے دنوں آر جے ڈی میں مسلمانوں کو نظرانداز کیے جانے کے سبب پارٹی چھوڑنے والے سابق ایم پی ڈاکٹر احمد اشفاق کریم کا فیس بک صفحہ بھی اردو سے خالی نظر آیا۔ ان کی حالیہ پوسٹ ہندی ہی میں دیکھنے کو ملی۔ کٹیہار اور کشن گنج میں کانگریس پارٹی کے امیدوار طارق انور اور ڈاکٹر جاوید کے لیے انتخابی مہم میں سرگرم کدوا سے ایم ایل اے ڈاکٹر شکیل احمد خاں کے فیس بک اکاؤنٹ پر بھی صرف ہندی ہی میں پوسٹ نظر آئی۔

جے ڈی یو ایم ایل سی ڈاکٹر خالد انور پچھلے کئی دنوں سے کشن گنج لوک سبھا حلقے میں پارٹی کے امیدوار ماسٹر مجاہد عالم کے لیے انتخابی مہم چلا رہے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ ایک ہفتے میں اپنے فیس بک پر صرف ایک بار اردو میں پوسٹ کیا ہے اور وہ بھی جولائی 2023 کی ایک پرانی تصویر کے حوالے سے، جسے اردو جاننے والی ایک بڑی آبادی نے سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی قرار دیا۔ اس کے علاوہ ان کی سبھی پوسٹ ہندی زبان میں ہیں۔

سید افضل عباس بہار اسٹیٹ شیعہ وقف بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ وہ بھی انتخابات کے موسم میں سرگرم ہیں اور کشن گنج سے جے ڈی یو امیدوار مجاہد عالم کے لیے ووٹ مانگ رہے ہیں۔ ان کے فیس بک اکاؤنٹ پر بھی اردو نظر نہیں آئی۔ پورنیہ لوک سبھا حلقے سے آر جے ڈی امیدوار بیما بھارتی کو جتانے کی بجائے پپو یادو کو ہرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے والوں میں پارٹی کے ایم ایل سی قاری صہیب بھی سرگرم ہیں۔ لوگوں کو حکومت میں رام لوچن کی مبارک باد دینے والے قاری صہیب کے فیس بک صفحے پر بھی کم سے کم حالیہ دنوں میں اردو میں کوئی پوسٹ دیکھنے کو نہیں ملی ہے۔ یہی حال آر جے ڈی کے ایک اور ایم ایل سی سید فیصل علی کے فیس بک صفحے کا ہے۔ وہ بھی ان دنوں پورنیہ میں بیما بھارتی کے لیے خون پسینا ایک کر رہے ہیں لیکن جس اردو کی بدولت شہرت ملی، وہ اردو دور دور تک کم سے کم سوشل میڈیا پر ان کی تحریر اور تقریر میں تو نظر نہیں آتی ہے۔ اس سے بہار میں اردو اور اردو والوں کی صورت حال کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں ہے۔ البتہ بیماری کا پتا لگنے کے بعد اس کا علاج کیسے کیا جائے، اس کے لیے فوری اقدام کے ساتھ ہی طویل مدتی لائحہ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ شاید اس سے بھی بڑی تحریک اور جدوجہد کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان بن سکی اور پھر بہت سوں کا چولہا صرف اردو کے سبب جلنے لگا اور آج بھی جل رہا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو میں ماحولیات اور دیگر سائنسی موضوعات پر آسان زبان میں کتابیں شائع کی جائیں

پروفیسر تسنیم فاطمہ

قومی اردو کونسل میں نئے مسودات کی اشاعت کے حوالے سے میٹنگ

نئی دہلی (پریس ریلیز، 19 مارچ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں آج ایک میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں کونسل کو موصول ہونے والے مختلف مسودات/تراجم کی اشاعت کے سلسلے میں غور و خوض کیا گیا اور میٹنگ میں شریک ماہرین کی رائے کے بعد اس حوالے سے حتمی فیصلے کیے گئے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کی اور کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ایک معیاری ادارہ ہے، اس لیے ہمیں یہاں سے معیاری کتابیں ہی شائع کرنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت کئی ایسے اہم موضوعات ہیں، جن پر اردو میں بہت کم مواد دستیاب ہے، اس لیے ادب کی اشاعت کے علاوہ ہمیں اس پہلو پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل سے عصری موضوعات پر دوسری زبانوں میں شائع شدہ اہم کتابوں کے اردو تراجم کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ میٹنگ کی چیئرپرسن پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کونسل کے نو منتخب ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کی اور کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں نئے موضوعات، خصوصاً سائنس، ماحولیات اور لائف سائنس کے دوسرے گوشوں پر آسان زبان میں کتابیں مہیا کروانا ضروری ہے تاکہ نئی نسل ان سے بخوبی استفادہ کر سکے۔

میٹنگ کے دیگر ممبران میں پروفیسر عارفہ بشریٰ (ڈین اسکول آف آرٹس وصدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر سید مشیر عالم (سکریٹری اوڈیشہ اردو اکیڈمی) اور جناب پی وی سوریہ نارائن مورتی (مہک حیدرآبادی، ڈپٹی نیوز ایڈیٹر روزنامہ آندھرا جیوتی) آن لائن شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) اور جاوید عالم (ٹیکنیکل اسسٹنٹ) بھی موجود رہے۔ فرزد عالم نے تکنیکی سپورٹ فراہم کیا۔

ایک شام حیرت داؤدنگری کے نام

نئی دہلی (16 اپریل)۔ داؤدنگر میں مولانا حالی اردو لائبریری کے زیر اہتمام ایک شام حیرت داؤدنگری کے نام حافظ خورشید عالم کے دولت کدے پر منائی گئی جس کی صدارت حاجی خورشید عالم نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر عرفان آصف نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی حیرت داؤدنگری کے پوتے ماسٹر سہیل عالم، محمد شمیم عالم اور صلاح حیات رہے۔ جناب ساحر داؤدنگری نے حیرت داؤدنگری کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس کے بارے میں بطور خاص شرکا کو روشناس کرایا۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں ماسٹر آفتاب عالم نے ان کی ادبی کارگزاریوں کا جائزہ کیا۔ پروفیسر عرفان آصف نے حیرت داؤدنگری کی حیات اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جب کہ ساحر داؤدنگری نے تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ حیرت داؤدنگری شعر و ادب میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے، بغیر استاد کے وہ موزوں شعر کہتے تھے۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت بھی ہوتی تھی، قائم بیس سے ان کا تخلص حیرت داؤدنگری پڑ گیا اور حیرت داؤدنگری کے نام سے اپنے علاقے و دور دراز میں پہچانے گئے۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ تمام عمر نہایت خاموشی سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مشغول رہے۔

رفتید ولے نہ از دل ما

پروفیسر محمد علی اثر

حیدرآباد۔ اردو کے مشہور و ممتاز محقق، شاعر اور پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف، ماہر دکنیات پروفیسر محمد علی اثر کا 24 اپریل 2024 کی شب میں 74 برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ 25 اپریل کو بعد نماز ظہر جامع مسجد چوک میں ادا کی گئی۔ تدفین قبرستان مسجد الماس، چادر گھاٹ میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ ڈاکٹر راحت سلطانہ (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن) کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر 22 دسمبر 1949 کو پیدا ہوئے تھے۔ 1974 میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا اور 1980 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1987 تا 1988 شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں یونی ورسٹی میں ہی ایسوسی ایٹ پروفیسر اور مہمان پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دکنیات میں انھیں ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم (بانی ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد) کا جانشین کہا جاتا تھا۔ خلیق اور ملنسار شخصیت کے حامل پروفیسر اثر مرحوم اساتذہ اور طلبہ برادری میں کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ بیک وقت تنقید نگار اور تحقیق کار تھے۔ مخطوطات پڑھنے میں انھیں کافی مہارت تھی۔ غیر ملکی ریسرچ اسکالرز کی ایک بڑی تعداد نے بھی ان کی علمی معلومات اور تحقیق سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ خوش کلام شاعر بھی تھے، کلاسیکی انداز کے علاوہ جدید لب و لہجے میں کہی گئی ان کی غزلیں کافی مقبول ہوئیں۔ انھوں نے ایک طویل نعت شریف بھی لکھی اور نعتیہ مجموعہ بھی ترتیب دیا۔ ان کی تحریریں سادہ، سلیس اور معنی آفریں ہیں۔ دکنی ادب پر تحقیق کے باعث ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں بلکہ عصر حاضر میں دکنی ادب پر ان کی حیثیت اتھارٹی کی رہی ہے۔

ڈاکٹر فریاد آزر

نئی دہلی۔ منفرد لب و لہجے کے معروف شاعر ڈاکٹر فریاد آزر کا 12 اپریل 2024 کو طویل علالت کے بعد دہلی کے بترا اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ جگر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر تقریباً 68 برس تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر فریاد آزر کے انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ تدفین 13 اپریل کو بعد نماز ظہر حوض رانی قبرستان میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر فریاد آزر کا آبائی وطن بہار کا قصبہ بھدوہی تھا۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور بی ایڈ کیا اور پھر معروف نقاد اور محقق پروفیسر شمیم حنفی مرحوم کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ ملازمت کا آغاز انھوں نے ایم سی ڈی اسکول حوض رانی سے بہ حیثیت استاد کیا، پھر ترقی کر کے دہلی سرکار کے سینئر سیکنڈری اسکول سے بہ حیثیت لکچرر ریٹائر ہوئے۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'خزاں میرا موسم'، 'قسطوں میں گزرتی زندگی'، 'ایلین' اور بچوں کے ادب پر کئی کتابیں شامل ہیں۔ اردو اکیڈمی دہلی سمیت کئی اداروں نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انعامات سے نوازا تھا۔

عارف ایوبی

لکھنؤ۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سابق صدر اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے سابق چیئرمین پروفیسر عارف ایوبی کا 12 اپریل 2024 کی صبح تقریباً چار بجے حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ پروفیسر عارف فریدی ایوبی جنھیں عارف ایوبی کے نام سے جانا جاتا تھا، ان کا آبائی وطن سندیلہ تھا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کے مراحل لکھنؤ یونی ورسٹی میں طے ہوئے۔ انھوں نے فارسی ادبیات میں پی ایچ ڈی کی اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں وہ استاد مقرر ہوئے اور پھر شعبے کے صدر بھی ہوئے۔ اپنے ادوارِ کار میں پروفیسر ایوبی نے فارسی زبان و ادب کے فروغ کے لیے جدید تکنیک کا سہارا بھی لیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ ان کی کوشش تھی کہ فارسی کو مزید دل چسپ بنایا جائے تاکہ جو لوگ فارسی کو ایک مشکل زبان سمجھتے ہیں وہ فارسی کے قریب آئیں۔ ان کی اس راہ میں کی گئی مساعی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پروفیسر ایوبی یوپی ایس سی کے پینل میں بھی شامل رہے اور متعدد سلیکشن کمیٹیوں میں انھیں مدعو کیا جاتا رہا۔ فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ ان کی رہائش گاہ پر ان ہی کی بنائی ہوئی پینٹنگس کا بھی ذخیرہ موجود تھا۔ وہ جدیدیت سے بہت متاثر تھے اور اسی طرح کے افسانے بھی لکھتے تھے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'بھیڑ' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ انھوں نے اترپردیش کے سابق گورنر شری رام نائک کی کتاب 'چریویتی چریویتی' کا عربی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کر کے اپنی زبان دانی کا لوہا منوایا۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی وطن سندیلہ لے جایا گیا جہاں بعد نماز جمعہ ان کی تدفین عمل میں آئی۔

ستیش نگار

مرادآباد۔ مرادآباد کے سینئر اردو اور ہندی ادیب ستیش کمار گپتا نگار 14 اپریل کی صبح انتقال کر گئے۔ وہ کافی عرصے سے بیمار تھے۔ ان کی آخری رسومات شام چار بجے ویدک رسومات کے مطابق ادا کی گئیں۔ وہ 25 جنوری 1941 کو نئی بستی، مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے مرادآباد کے ہندی اور اردو ادب میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ ان کی شائع شدہ تصانیف میں فکر جمیل (اردو اور ہندی دونوں میں غزلوں کا مجموعہ)، خواب پریشاں (اردو)، عکس جمال (اردو میں غزل کا مجموعہ)، کوثر مدحت (اردو میں منقبت)، ترنگ (ہندی میں شعری مجموعہ) شامل ہیں۔ بھیگے نین (شعری مجموعہ ہندی)، خلوت (اردو میں غزلوں کا مجموعہ)، جیتا اور ہنستا چل (ہندی میں) اور محسن اسلام وغیرہ ادبی دنیا میں بہت مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ ان کی کئی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔

شری نگار کاویہ سدھا لٹریری فورم مرادآباد کے صدر اور انٹرنیشنل لٹریری آرٹس فورم، مرادآباد کے تاحیات رکن بھی تھے۔ وہ عمر بھر شہر کے کئی دوسرے ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے ایک بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر وکیل کے طور پر بھی معاشرے کی خدمت کی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

بقیہ: پروفیسر آفاق احمد کا کار جہاں دراز

(صفحہ 1 سے آگے)

جو استاد 29 طلبہ کو اپنی نگرانی میں تحقیقی کام کرا چکا ہو، اس کی حیثیت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود تحقیق ادب میں ان کی سست گامی کی وجہ یہی ہے کہ ان کی توجہ اپنے طلبہ پر زیادہ مرکوز رہی اور جو وقت ملا وہ سیمناروں اور دیگر علمی پروگراموں کی نذر ہو گیا۔ اسی درمیان آفاق صاحب نے پانچ سال مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری کے فرائض انجام دیے اور اکادمی کے سیمناروں یا دوسرے پروگراموں میں بڑی ہستیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان سے مقالات وغیرہ تحریر کرانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتے رہے۔

آفاق صاحب ایک کامیاب مولف بھی تھے، بظاہر تالیف و تدوین کا کام آسان نظر آتا ہے، لیکن اوہ کافی وسیع سوری کا طالب، کیوں کہ اس کے لیے مولف کا کثیر المطالعہ اور موضوع پر گہری دسترس رکھنا ضروری ہے، جن میں (1) مثنوی سحر البیان، (تنقیح شرح و تقریظ)، (2) 'صورت ات' (علامہ رموزی کے غیر مطبوعہ مضامین مع پیش لفظ)، (3) 'اقبال آئینہ خانہ میں' (اقبال صدی پر سیمنار کے تحقیقی و تنقیدی مقالات)، (4) 'نگارشات' (حکیم سید قمر الحسن کے مضامین)، (5) 'یا مجلس اقبال' اور 'مجلس اقبال' (علامہ اقبال پر منعقدہ سیمناروں کے آٹھ مجموعے)، (6) 'پریم چند شناسی' (پریم چند پر مقالات)، (7) 'مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب' (اردو اکادمی سیمنار کے تحقیقی و تنقیدی مقالات)، (8) 'کلام رمزی' (سعید اللہ خاں رمزی کے کلام کا مجموعہ)، (9) مجلس ملنوان، (ترتیب و پیش کش)، (10) 'داستان سفر' (حصہ اول، دوم اور سوم)۔

مذکورہ کتابوں کی تالیف کے علاوہ زبان و ادب کے فروغ میں آفاق صاحب کی مزید کارگزاری درج ذیل ہے:

(1) مدھیہ پردیش پاٹھیہ پستک نگم نصاب کی بال بھارتی (حصہ ششم، ہشتم) کی ترتیب میں تعاون۔

(2) ایم پی بورڈ ایجوکیشن گرانٹ کمیشن کی B.A II کی اردو نصابی کتاب کی تدوین میں تعاون۔

(3) مدھیہ پردیش محکمہ اعلا تعلیم کی اردو نصابی کتابوں میں شریک مدیر۔

(4) 'شریف زادہ' مرزا ہادی رسوا اسے نصاب B.A II کی تلخیص۔

ان کے ساتھ آپ نے سہا مجددی کے 'مطالب انقلاب' اور 'دیوان بحر' کے نئے عکسی ایڈیشن کا مقدمہ بھی تحریر کیا۔

آفاق صاحب صحافی تو نہیں تھے لیکن ادبی صحافت سے ان کی دلچسپی زمانہ طالب علمی سے تھی۔ اسکول اور کالج کی میگزین کے بالترتیب 1949 اور 1954 میں ایڈیٹر رہے تھے۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد 'ملاپ' اور 'تیج' کے لیے نامہ نگاری کی اور بھوپال سے شائع روزنامے 'آفاق' اور 'ندیم' میں کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ ستمبر 2013 سے 'ندیم' بھوپال میں پھر کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ادبی موضوعات نیز ہم عصر شخصیات پر وہ 'آئینہ خانہ' کے عنوان سے کالم لکھتے تھے۔ ان کا حافظہ اچھا تھا۔ جس کا مہم میں وہ کروہ حصہ نے تحقیقی کام میں مدد کا۔ بچے، اس کا اندازہ مذکورہ کالموں سے بھی ہوتا ہے، جس کو دفتر ندیم تک پہنچنے کے لیے کچھ کرانے، پروف پڑھنے کی ذمے داری راقم نے لے رکھی تھی۔ آتے آفاق صاحب کی حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ وہ کالم کے لیے نت نئے موضوعات کا انتخاب کرتے، اس کی مناسبت سے تصاویر بھی فراہم کر دیتے تھے۔ صحت کی ناسازی، ملک و بیرون ملک کے دورے اور سیمناروں میں شرکت کی وجہ سے یہ کالم مسلسل نہیں لکھا جا سکا۔ کالم جو بھی تحریر ہوئے ہیں، انھیں مرتب کر کے شائع کیا جا سکتا ہے۔

آفاق صاحب نے عمر کے آخری حصے میں شاعری کی، کوثر صدیقی صاحب کے بقول 'وہ اچھے شاعر تھے اور شاعری کے عیب و ہنر سے بخوبی واقف تھے، لیکن اپنی غزلیں اور نظمیں انھوں نے رسائل میں چھپوانے یا مشاعروں میں سنانے میں دلچسپی نہیں لی۔ ایک منتظم کی حیثیت سے بھی آفاق صاحب گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے، اپنی 33 سالہ ملازمت کے دوران انھوں نے کوئی پندرہ سال حمیدیہ کالج اور لکشمی بائی گرلز کالج میں شعبہ اردو کی کامیاب سربراہی کی، اس کے بعد سکریٹری اردو اکادمی کے عہدے پر پانچ برس خدمات انجام دینے کے باوجود اپنے حسن انتظام سے کسی قسم کی عوامی تنقید یا تنازعے کا شکار نہ بنے، ساتھ ہی سندھی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے طور پر انتظامی امور انجام دیتے رہے اور ان اداروں سے سبکدوش ہونے کے بعد علامہ اقبال ادبی مرکز کے بھی پانچ سال سکریٹری رہے۔ اس پورے عرصے میں ان کا دل اردو کی خدمت سے سرشار رہا، جس کے عملی مظاہرے کے طور پر انھوں نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے بعد سندھی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے کوئی تنخواہ نہیں لی۔ صرف ایک روپے ماہانہ اعزازیہ پر اس سال تک اپنی صلاحیتوں اور تجربوں سے مذکورہ اداروں کو نوازتے رہے، اس کے علاوہ علامہ اقبال ادبی مرکز کو ذاتی لائبریری کی 1535 کتابیں عطیہ کیں اور باقی ماندہ کتب ان کی وصیت کے مطابق انتقال کے بعد ایک ٹرک میں بھر کر دار العلوم تاج المساجد بھوپال کے سلیمانیہ کتب خانے پہنچا دی گئیں۔

آفاق صاحب کی تحریر کی طرح ان کی تقریر بھی اثر و تسلیم سے خالی محسوس ہوتی تھی۔ کلاس روم میں ان کا لیکچر جتنا معلوماتی ہوتا، اتنی ہی موثر تقریر وہ عوامی جلسوں، ادبی و تہذیبی پروگراموں میں کرتے بلکہ یہ کہا جائے تو حسب حال ہو گا کہ ان کی زبان سے ادا ہونے والے ہر جملے کے پیچھے ایک شاعرانہ ذہن اور فکر کی گہرائی ہوتی تھی۔ لکھنا، پڑھنا اور بولنا ان کا شوق ہی نہیں مزاج کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ جس زبان کو بولتے تھے اسی میں لکھتے بھی تھے، اسی لیے ان کی تحریر و تقریر میں گہری یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی بیشتر جامعات اور ادبی مراکز تو ان کے چہیتے ہوئے تھے، اس کے علاوہ پاکستان، انگلستان اور کینیڈا کے سیمناروں اور ادبی جلسوں میں بھی انھیں مدعو کر کے اعزاز سے سرفراز کیا جاتا رہا۔ آفاق صاحب کی اس علمی و ادبی بصیرت کے اعتراف کے طور پر انھیں یادگاری خطبات پیش کرنے کے لیے بھی دعوت دی گئی۔ 2011 میں فراق گورکھپوری کی شاعری: فکر و نظر پر آفاق صاحب نے قومی اردو کونسل نئی دہلی کے زیر اہتمام یادگاری خطبہ دیا، دوسرے خطبے کا موقع انھیں 2015 میں مولانا ابو الکلام آزاد یونیورسٹی جودھپور میں ملا، جہاں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی صدی کی مناسبت سے شبلی کے تعلیمی نظریات پر سیر حاصل خطاب فرمایا۔

آفاق صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف یوں تو پوری اردو دنیا میں ہوا، لیکن مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا میر تقی میر ایوارڈ انھیں کافی تاخیر سے تفویض ہوا، اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ وہ طویل عرصے تک اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہ ایوارڈ ظاہری انھیں نہیں دے سکتی تھی، پھر بھی زندگی کے آخری حصے میں حق بحق دار رسید کے مصداق وہ اس اعزاز سے نوازے گئے، جس کو برسوں دوسروں کو دیتے رہے تھے۔

آفاق صاحب کی زندگی وفاداری بشرط استواری کی ایک مثال ہے، بائیں بازو کے جن نظریات سے انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے وسیلے سے رشتہ قائم کیا، اس کو آخر دم تک برقرار رکھا، ان کی دوسری خصوصیت تہذیبی وفاداری اور ہمہ رنگی تھی، تاہم یہ بھی سچائی ہے کہ وہ تحریکی مزاج کے مالک نہیں تھے بلکہ ذہنی طور پر بائیں بازو کا ساتھ نبھاتے رہے، اس لیے وہ دوسروں کو نظریاتی اچھوت نہیں مانتے تھے، ان کا سلوک سب کے ساتھ عموماً معاملہ فہمی کا ہوتا تھا اور اسی رویے کی بنا پر وہ ہر جگہ اپنا مقام بنا لیتے تھے۔ بحیثیت مجموعی وہ اس گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ تھے، جو غلو آمیز قوم پرستی کی بنا پر آج اپنی صحیح شکل و صورت کھوتی جا رہی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد اپنی خداداد صلاحیت اور اساتذہ کی تربیت کے نتیجے میں بہت جلد اپنے اساتذہ کی صف میں کھڑے نظر آنے اور ایک وقت وہ آیا کہ اپنے اساتذہ کے لیے اور اساتذہ اپنے شاگرد کے لیے باعث فخر ثابت ہوئے۔ آفاق صاحب اعلا درجے کے مدرس ہونے کے ساتھ اوّل درجے کے کھلاڑی بھی تھے۔ انہوں نے 1958 میں سری لنکا میں منعقد بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ میں بھوپال ہاکی ٹیم کی بطور کپتان قیادت کی اور دیگر اہم میچوں میں ٹیم اُن کی قیادت میں کھیلتی رہی۔ وکرم یونیورسٹی اُجین کی نمائندگی کے ساتھ ہاکی کے علاوہ باسکٹ بال اور جمپنگ میں بھی انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ جلد ہی ان کی شناخت ایک ایسے ماہر تعلیم کی ہو گئی جو طلبہ کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی بلکہ عرق ریزی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ حمیدیہ کالج اور مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج کی ملازمت کے عرصے میں انہوں نے جہاں سیکڑوں طلبہ و طالبات کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کیا، وہیں 29 طلبہ و طالبات کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کرائی، جب کہ 21 طلبہ کو ایم اے سال آخر کے ایک پرچے کے مترادف تحقیقی مقالے اپنی زیر نگرانی مکمل کرائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبۂ تعلیم میں اُن کی سرگرمی مثالی رہی۔ اسی طرح اُن کے زیر تعلیم و تربیت جو طلبہ رہے، فراغت کے بعد انہوں نے جن شعبوں میں قدم رکھا، ان میں اپنی خاص شناخت بنائی۔ ایسے ہونہار طلبہ میں ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر راحت اندوری، ڈاکٹر ویرمتی (سبکدوش پولس افسر) شامل ہیں۔

عارف عزیز
20- کمانی جز بھوج پورہ نکیا بھوپال- 462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

بقیہ: نیر مسعود کی شخصیت کے چند پہلو

افسانوں کا مفہوم خود افسانہ نگار کے ذہن میں بھی واضح نہیں تھا۔

نیر صاحب نے افسانہ نگاری میں ایک بالکل نئی راہ نکالی۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے ہندوستان میں شائع ہوئے سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا اور گنجفہ۔ اس پانچواں مجموعہ 'دھول بن' پاکستان سے اجمل کمال کے ادارے 'آج' نے شائع کیا ہے۔

یہ افسانے ہماری روایت سے خاصے مختلف ہیں ان میں نہ روایتی افسانوں کی طرح ابتدا ہوتی ہے اور نہ ان کا کوئی فطری یا قاری کی امید کے مطابق انجام ہوتا ہے۔ یہ افسانے گویا وسط میں رہتے ہیں مگر نیر صاحب کی نثر اتنی دلکش مگر آرائش سے پاک ہوتی ہے کہ اس نثر کی کوئی مثال لانے میں اردو افسانہ عاجز ہے۔

ان کے افسانوں میں لکھنؤ کی پرانی اور مٹتی ہوئی تہذیب اور ثقافت خاموشی کے ساتھ اپنے جلوے دکھاتی رہتی ہے۔ چکن کے کام لکھنؤ کے حکما، معمار، پرندے، عطر سازی وغیرہ سب کا بیان موجود ہے مگر کہانی کے بہاؤ میں یہ سب اتنی خاموشی اور فنکاری کے ساتھ ہوتا ہے کہ فوری طور پر ہمیں اس کا کم احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو افسانے کو منطق اور ترتیب زندگی کے جبر سے آزاد کر دیا اور انسانی فکر کو پوری آزادی اور فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کافکا کی سی پراسرار فضا قائم رہتی ہے یہ اسرار خود ہماری زندگی اور معاشرے میں موجود ہے۔ بس شرط غور کرنے کی ہے۔ زندگی، موت اور کائنات اپنے آپ میں ایک اسرار ہیں۔ ان کے افسانوں کو اگر اس طرح دیکھا جائے تو شاید انصاف کی راہ نکل سکتی ہے، اکثر حقیقت، افسانے سے زیادہ حیرت زدہ کرنے والی ہوتی ہے یہ نہیں بھولنا چاہیے۔

نیر صاحب واقعات اور واردات کے بارے میں صرف بتاتے نہیں ہیں ہمیں تقریباً یہ سب ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں، یہ نثر کا اعجاز ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں 'اوجھل' 'وقفہ' اور 'سیمیا' میں جو کچھ شائع کیا ہے اس سے کہیں زیادہ حصے پر خط تنسیخ کھینچ دی تھی۔ دوسرے وہ بتانے سے زیادہ چیزوں کو چھپانے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ افسانے میں لکھنے کے بعد جو چیزیں ہٹا دی جائیں، غیر محسوس یا پراسرار طور پر وہ بھی قاری تک منتقل ہو جاتی ہیں۔

پریم چند کا مشہور افسانہ 'شطرنج کے کھلاڑی' جس پر ستیہ جیت رے نے فلم بھی بنائی تھی۔ 'طاؤس چمن کی مینا' اس کو رد کرتا ہے مگر بے حد خاموشی کے ساتھ۔ نیر صاحب اس افسانے میں بتاتے ہیں کہ بادشاہ اپنی چالیس میناؤں کو ان کے جو نام انھوں نے دیے ہیں ان سے شناخت کر لیتے ہیں اور شیرنی ان کے دیر سے آنے پر ناراض ہو کر دہاڑتی ہے اور ان کو سامنے دیکھ کر خوش ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اور مینا کی چوری پر کالے خاں کو برطرف کر دیا جاتا ہے مگر نوکری بحال رکھی جاتی ہے پھر رحم دل بادشاہ کس طرح انگریزوں کی سازش کا شکار ہوتا ہے۔

اسی طرح 'سلطان مظفر کا واقعہ نویس' میں وہ دکھاتے ہیں کہ تاریخ کتنے جبر کے سایے میں لکھی جاتی ہے۔ اصل میں سلطان مظفر کی ایک صحرائی مہم ہوتی ہے اور صحرائی قبائل سے جنگ کر کے وہ اسے حاصل بھی کر لیتا ہے مگر وہ چھت کے تصور سے ہی ہراساں ہو کر مر جاتی ہے اس کی یاد میں سلطان بغیر چھت کا مقبرہ بنواتا ہے اور اسے اپنے مقبرے کے طور پر مشہور کرواتا ہے۔ اس ایک واقعے سے وہ تاریخ پر ایک سوالیہ نشان قائم کر دیتے ہیں کہ جو لکھا گیا ہے اس پر کس حد تک یقین کیا جا سکتا ہے۔

'سوغات' میں جب نیر مسعود پر محمود ایاز نے گوشہ نکالا تو بہت کم لوگوں نے مضامین لکھے ہاں شافع قدوائی نے ایک بہت عمدہ مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے اس کے بعد دو یا تین افسانوں کے تجزیے بھی کیے اور گزشتہ سال میں نے جب نیر مسعود پر ایک سیمینار کا لکھنؤ میں انعقاد کیا تو اس میں بھی انھوں نے بہت فکر انگیز مضمون پیش کیا، قاضی افضال حسین، خالد جاوید اور خورشید اکرم وغیرہ نے سیمینار میں بہت اچھے مقالے پیش کیے۔

نیر صاحب کے افسانوں کے انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔ میرے خیال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ افسانے کی بنی ہوئی شعریات کے سہارے شاید ہم ان افسانوں کے ساتھ انصاف نہیں کر پا رہے ہیں۔ شافع قدوائی، قاضی افضال حسین اور خالد جاوید نے غیر ملکی افسانوں کا بھی خوب مطالعہ کیا ہے۔ خود نیر صاحب نے کافکا کے افسانوں کا ترجمہ کیا تھا اور انھیں کافکا اور ایڈگر ایلن پو کی تخلیقات پسند بھی بہت تھیں۔

کافکا پر اس کے دوست MAX Brod سے کر ڈی ایچ لارنس اور دیگر زبانوں کے تقریباً ہر بڑے نقاد نے لکھا ہے اور اپنے طور پر اس کی ستائش کی ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم کافکا (FRANZ KAFKA) کے مشہور ناولٹ میٹا مارفیسس (META MORPHASIS) اور THE TRIAL (دا ٹرائل) کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کافکا کی شرائط قبول کرتے ہوئے اس کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں اور Meta Morphasis میں جب ہیرو ایک کیڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ہم اسے قبول کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یا The Trial میں جب ہیرو کو یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ اسے کس جرم میں ماخوذ کیا گیا ہے اور وہ عدالت کے باہر دنوں سے کمرۂ پیشی کا انتظار کرتا رہتا ہے تب بھی ہم استدلال کے بجائے اس صورت حال سے گزرتے رہتے ہیں گویا دیگر زبانوں میں اس طرح کے افسانوں کی تفہیم کے لیے انھوں نے اپنی شعریات تبدیل کر لی ہیں۔ اسی لیے ژاک دریدا JACK DARIDA نے اپنی مشہور کتاب Act of Literature میں کافکا پر 73 صفحات کا مضمون لکھا اور مختلف توجیہات بیان کیں۔ مگر ہم ابھی تک عمل اور رد عمل سے آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں۔ ہم جب تک نیر مسعود کی بنائی ہوئی افسانوی دنیا کو ان کی شرطوں کے مطابق قبول نہیں کریں گے اور اپنی بنی بنائی شعریات سے باہر نہیں نکلیں گے تب تک نہ تو خود سے نہ افسانہ نگاری کے فن سے اور نہ نیر مسعود کے افسانوں سے انصاف کر پائیں گے۔
نیر صاحب کے ناقدین بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ صاحب یہ افسانے اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ ایک بار شروع کرنے پر افسانہ خود کو پڑھوا کر ہی دم لیتا ہے ہاں بعد میں احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

غالب کی طرح میرا خیال ہے مستقبل میں ان افسانوں کی ایک سے زیادہ تفہیمیں کی جائیں گی اور اچھے شعر کی طرح ہر تاویل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی قابل قبول ہوگی۔ شاید یہ بڑے فنکار کی خصوصیت بھی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ نیر مسعود اردو کے سب سے منفرد اور عظیم افسانہ نگار ہیں۔ میری رائے سے دوسروں کو اختلاف ہو سکتا ہے ظاہر ہے ادب ایک جمہوریت ہے جہاں پر ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔

ڈاکٹر شعیب نظام
105/591، حافظ حلیم کپاؤنڈ، ہمتا پور، سجن گنج، کان پور-208001
Mob.8960416841

مکتبہ جامعہ آخری سانسیں گن رہا ہے

معصوم مرادآبادی

علمی اور ادبی کتابوں کا سب سے بڑا مرکز مکتبہ جامعہ بستر مرگ پر ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ ایک صدی تک لاکھوں ذہنوں کو منور کرنے والے اس ادارے نے اگر یوں ہی دم توڑ دیا تو یہ اردو زبان اور اس کی تہذیب کا بڑا نقصان ہوگا۔ مکتبہ جامعہ میں ڈھائی سال سے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملی ہیں اور وہ فاقہ کشی تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود کہیں کوئی جنبش نظر نہیں آتی۔ پچھلے دنوں مکتبہ جامعہ کی علی گڑھ شاخ کے انچارج محمد صابر نے جامعہ کے ذمہ داروں کو جو خط لکھا تھا، وہ اس کرب کا مکمل اظہار ہے، جس سے ملازمین گزر رہے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ ”ڈھائی سال سے ہم بغیر تنخواہ کے کام کررہے ہیں۔ فاقہ کشی کی نوبت آگئی ہے۔ اب گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں گھر والے ضروری سامان کا تقاضا نہ کردیں۔ دوسرا راستہ کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ گھر چھوڑ کر کہیں گم ہوجائیں اور گھر والوں کو بے سہارا چھوڑ دیں۔ خودکشی جائز نہیں ہے۔ لیکن ایسے حالات میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔“

اس خط سے مکتبہ جامعہ کے ملازمین کا کرب سمجھنے میں آسانی ہوگی، لیکن المیہ یہ بھی ہے کہ مکتبہ جامعہ کے ہیڈ آفس میں برسرکار بعض ملازمین کا رویہ ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے مکتبہ کو یہ دن دیکھنے پڑرہے ہیں۔ اس کی مثال دہلی میں مکتبہ جامعہ کی اردو بازار شاخ ہے، جس میں ایک بار پھر تالا ڈال دیا گیا ہے۔ گزشتہ سال ستمبر میں جب یہاں تالا ڈال کر اس کے انچارج علی خسرو زیدی کو گھر بٹھا دیا گیا تھا تو راقم نے اس معاملے کو سوشل میڈیا کے ذریعہ اردو والوں تک پہنچایا تھا۔ اس پوسٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہ معاملہ قومی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنا۔ انگریزی روزنامہ ’ٹائمز آف انڈیا‘ اور مشہور ویب سائٹ ’دی وائر‘ کے ساتھ ہی روزنامہ ’انقلاب‘ نے بھی اس مسئلے کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ میڈیا رپورٹوں کے دباؤ میں ہیڈ آفس نے علی خسرو زیدی کو واپس بلاکر مکتبہ کی اردو بازار شاخ کو دوبارہ کھول دیا۔ اس موقع پر ہیڈ آفس کے انچارج نے یہ بیان دیا کہ اردو بازار شاخ در اصل ’جی 20‘ اجلاس کی وجہ سے بند کی گئی تھی لیکن اب جب کہ اردو بازار شاخ میں دوسری تالابندی کو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے تو اس کے بند کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے۔

ہم نے جب اس معاملے کی چھان بین کی تو پتا چلا کہ گزشتہ سال ستمبر میں اردو بازار شاخ تو کھول دی گئی تھی مگر ہیڈ آفس میں بیٹھے ہوئے تن آسان لوگوں نے علی خسرو زیدی کے ساتھ تعاون نہیں کیا، جس کے نتیجے میں وہ گزشتہ 22 فروری کو حساب کتاب ہیڈ آفس انچارج کے سپرد کرکے گھر بیٹھ گئے۔ تب سے اب تک مکتبہ جامعہ کی اردو بازار شاخ بند پڑی ہوئی ہے اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ میں گزشتہ ہفتہ کسی کام سے اردو بازار گیا تو صورت حال کا علم ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مکتبہ جامعہ کئی برسوں سے ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہے۔ تقریباً ڈھائی سال سے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملی ہیں اور جو کتابیں اسٹاک میں ختم ہوئی ہیں، وہ ڈیمانڈ کے باوجود شائع نہیں کی جارہی ہیں۔ حالات دن بہ دن ابتر ہوتے جارہے ہیں اور وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کے پاس مکتبہ کے 90 فیصد شیئر ہیں، اس سے آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ کی دہلی، بمبئی اور علی گڑھ میں تین شاخیں ہیں اور یہ بہت پرانی جگہوں پر ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی کے پٹودی ہاؤس میں لبرٹی آرٹ پریس کی قیمتی عمارت بھی مکتبہ جامعہ کی ملکیت ہے۔ دہلی کے ہی بوانہ علاقے میں مکتبہ جامعہ کی ایک اور قیمتی اراضی ہے، لیکن یہ سب مکتبہ کے کارپردازوں کی بے حسی کا شکار ہیں۔ مکتبہ میں اس وقت کوئی مینجنگ ڈائرکٹر بھی نہیں ہے جس کی تقرری خود جامعہ کرتا ہے اور یہ کام اشاعتی صنعت سے واقف فرد کی بجائے کسی پروفیسر کو دیا جاتا ہے۔ پچھلی تقرری کامرس کے پروفیسر ایم یو خان شیروانی کی صورت میں کی گئی تھی، لیکن انھوں نے بھی اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مکتبہ جامعہ کے قیام کی داستان 1920 میں ایک ساتھ شروع ہوئی تھی۔ مکتبہ جامعہ کے قیام اور جدوجہد کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی۔ جامعہ جہاں درس وتدریس کا ادارہ تھا تو وہیں مکتبہ جامعہ لوگوں کو ذہنی غذا فراہم کرنے کا ذریعہ تھا۔ یہ محض کوئی کاروباری اشاعت گھر نہیں تھا بلکہ اس نے مواد کے اعتبار سے انتہائی قیمتی کتابیں ارزاں قیمت میں شائع کیں اور لاکھوں لوگوں کے ذہن وشعور کو سیراب کیا۔ مکتبہ جامعہ نے خاکی لاٹھوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبہ کی نصابی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں بھی شائع کیں۔ ’معیاری سیریز‘ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اہل علم ودانش اور طلبہ مکتبہ جامعہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور دانش گاہوں میں اس کی مطبوعات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ کے ساتھ ساتھ مکتبہ جامعہ نے بھی ترقی کی منزلیں طے کیں اور یہ جامعہ کے بازو کے طور پر ایک ایسا ادارہ بن گیا جو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔ جامعہ کی لائبریری کو بھی مکتبہ جامعہ سے بہت تقویت حاصل ہوئی لیکن گزشتہ ایک عرصے سے مکتبہ جامعہ کا اشاعتی کاروبار ٹھپ ہے۔ نہ تو وہاں سے کوئی نئی کتاب شائع ہوئی ہے اور نہ ہی اس ادارے کے تاریخ ساز جریدے ”کتاب نما“ اور ”پیام تعلیم“ کی اشاعت باقی رہی ہے۔ کتابوں کے دو درجن سے زائد ٹائٹل جن کی اردو والوں میں ہمیشہ مانگ رہی ہے اور جو مکتبہ جامعہ کی شناخت سمجھے جاتے ہیں، ناپید ہیں اور دور دور تک ان کی اشاعت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

مکتبہ جامعہ پر پہلا ستم یہ ہوا کہ پروفیسر مشیرالحسن کے دور میں گول مارکیٹ میں واقع مکتبہ کی عمارت پر بلڈوزر چلاکر یہاں ارجن سنگھ کے نام پر فاصلاتی تعلیم کا ایک ادارہ قائم کردیا گیا اور مکتبہ جامعہ کو جامعہ کالج کے پیچھے جھونپڑیوں میں منتقل کردیا گیا۔ اسی دور میں مکتبہ جامعہ سے شاہد علی خاں بھی علاحدہ ہوئے، جنھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے ادارے کو بام عروج تک پہنچایا تھا۔ مکتبہ جامعہ کی عمارت جن جھونپڑیوں میں منتقل ہوئی تھی وہاں ان قیمتی کتابوں کو بری حالت میں دیکھا گیا۔ اس کے بعد مکتبہ انصاری ہیلتھ سینٹر کی عمارت میں منتقل ہوا اور اس طرح وہ ایک یتیم بچے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ آج ہزاروں قیمتی کتابیں شائع کرنے والا یہ تاریخ ساز ادارہ اپنی حالت پر ماتم کناں ہے۔ چند سال قبل قومی اردو کونسل (این سی پی یو ایل) نے مکتبہ جامعہ کی دو درجن نایاب کتابیں اپنے صرفے پر شائع کیں۔ یہ کام پروفیسر خالد محمود کی کوششوں سے عمل میں آیا، جو اس وقت مکتبہ کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عروج وزوال دنیا کا دستور ہے اور آج اردو اشاعتی صنعت مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ لوگوں میں کتابیں خریدنے اور انھیں اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کا رواج دم توڑ رہا ہے۔ لیکن وہ ادارے ضرور ترقی کررہے ہیں جن کی وابستگی منظم اور مضبوط اداروں کے ساتھ ہے۔ مکتبہ جامعہ ایسا ہی ادارہ ہے جس کی وابستگی جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی مرکزی دانش گاہ کے ساتھ ہے۔ مکتبہ جامعہ کو نئی زندگی دینے کے لیے جامعہ کو ٹھوس منصوبہ بنانا چاہیے۔ اگر فوری طور پر مکتبہ جامعہ پر توجہ نہیں دی گئی تو ایک صدی تک لوگوں کے ذہنوں کو منور کرنے والا یہ تاریخ ساز ادارہ دم توڑ دے گا اور اس کا سب سے بڑا نقصان اہل علم ودانش کو پہنچے گا۔

معصوم مرادآبادی
D-7-103 نکیتن وہار، دہلی-110031
E-mail: masoom.moradabadi@gmail.com

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگران، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ پانچ روپے، سالانہ 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر
Subscription: (Per issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by Abdul Bari on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006. Editor: Dr Ather Farouqui